# مشرق اور مغرب کے معیاراتِ تنقید کا تصادم اور انجذاب

ڈاکٹر سلیم اختر*

**Abstract:**
It has been argued in this treatise that eastern and western attitudes to literary criticism cannot be one, or even similar. All efforts by writers/critics of the Indo-Pakistani sub-continent to absorb western philosophies or methodologies have ended in a fiasco. None of the Urdu writers from Hali down to the moderns has ever been able to apply, successfully, any western critical methodology to a creative writing in Urdu. It is not that they were not able critics. It is because eastern and western ways of thinking and feeling are drastically different from each other. Consequently literature produced in eastern societies and representing our cultural values cannot be evaluated by applying theories or methodologies developed in a different system of philosophical, cultural and social values. Hence this is a futile activity and must be abandoned altogether.

مشرق اور مغرب کے معیاراتِ تنقید کا تصادم اور انجذاب ___ دراصل تخلیق کے حوالہ سے ہے، یہ تہذیبی وثقافتی تصادم اور انجذاب کے وسیع کُل کا جزو ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا، ۱۸۵۷ء کے بعد جس میں تیزی پیدا ہوئی اور ۱۹۴۷ء کے بعد اِس سرعت سے غلبہ پایا کہ اب تو یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کیا پاکستان انگلش میڈیم سکولوں، برگر اور پیزا کے لیے بنایا گیا تھا، ان پر مستزاد کوک کلچر سے لے کر کلاشنکوف کلچر!

جہاں تک مغرب کے تہذیبی وثقافتی غلبہ کے اردو تنقید پر اثرات، انجذاب وتصادم یا اس عمل میں رکاوٹ بننے یا تبدیلی لانے کے لیے تنقید کے فعال، کردار کا تعلق ہے تو تخلیق کی تشریح، توضیح، فیصلہ، حکم، توصیف، تنقیص اور مقام ومرتبہ کے تعین جیسے اہم امور کی بجا آوری کے باوجود بھی ___ تنقید تخلیق سے، ایک قدم پیچھے رہتی ہے، اسی لیے مطالعۂ نقد سے پیشتر تخلیق پر ایک نگاہ ڈالنی ضروری ہے۔

خودکار اور خودمختار ہونے کے باوجود بھی تخلیق مخصوص جغرافیائی حدود اور کسی مخصوص خطہ میں زیست کرنے

* پروفیسر، ایمریطس گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور۔

والے افراد کے اجتماعی شعور کی مظہر ہوتے ہوئے بھی ''فرد'' اور ''معاشرہ'' کی میزان (فرد .Vs معاشرہ) ثابت ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ تخلیق خطہ کی تہذیب وثقافت سے بھی مشروط ہوتی ہے اس طویل اور اُلجھی بحث کو نقشہ کی مدد سے یوں واضح کیا جاسکتا ہے:

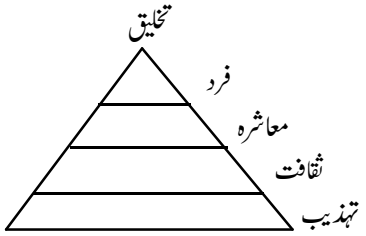


ان چار جہات یعنی تخلیق، معاشرہ، ثقافت اور تہذیب کو شعور، تحت الشعور، لاشعور اور اجتماعی لاشعور کے مساوی سمجھا جا سکتا ہے۔

چار جہات پر مشتمل اس عمل کو آئس برگ کی چوٹی کی مثال سے سمجھایا جا سکتا ہے، Tip of the Ice Burg تخلیق ہے جو الفاظ کے ذریعہ سے واضح اور ٹھوس صورت اختیار کرتی ہے جب کہ اسلوب، تکنیک اور فن کاری کے ذریعہ سے موضوع زود ہضم بنایا جاتا ہے۔

فرد سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ فرد معاشرہ کے بے عمل جزو کے برعکس با عمل بلکہ ردِعمل کرنے والا ثابت ہوتا ہے کہ فرد انفرادیت کا حامل بھی ہوتا ہے اسی لئے وہ معاشرہ سے برسرِ پیکار بھی رہتا ہے جس کا اظہار منفی کی انتہا پر جرم اور مثبت کی انتہا پر تخلیق سے ہوتا ہے۔ یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ جزو بگڑ کر کل میں فساد برپا کرتا ہے۔ چنانچہ مصلح، مُلّا، لیڈر، سماج سدھار کے لئے اپنی سی سعی کرتے رہتے ہیں مگر ان میں تخلیق کار کا کردار سب سے زیادہ فعال، موثر اور دوررس نتائج کا حامل ثابت ہوتا ہے کہ اُسے مقصد کے جن کو تخلیق کے چراغ میں بند کرنے کا ہنر آتا ہے، عصری شعور، جذباتی تموّج اور نفسیاتی ژرف بینی کی وجہ سے صدیوں کے بعد بھی وہ قارئین سے مکالمہ کرسکتا ہے۔

معاشرہ کے ''موزیک'' میں ثقافت رنگ آمیزی کا باعث بنتی ہے اس حد تک کہ انفرادی سوچ سے لے کر اجتماعی اقدار و معیارات اور ٹیبوز تک اس سے متاثر ہوتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فرد، معاشرہ، اقدار و معیارات اور ٹیبوز کے باہمی عمل اور ردِعمل سے جو پُر تضاد صورتِ حال جنم لیتی ہے ثقافت کے پاس اس کا کوئی موثر حل نہیں ہوتا۔ یوں فعال اور حرکی اور اعلیٰ ثقافت کے باوجود بھی فرد .Vs معاشرہ، قدر .Vs ذات اور خواہش .Vs ٹیبو ___ کی صورت میں، معاشرہ میں تضادات کے سلسلے، زیریں لہروں کی مانند موجزن رہتے ہیں یہ صرف فلسفی،

منطقی اور تخلیق کار ہے جو تحلیلی نگاہ ہے، ان کی تہہ تک پہنچ کر، ان کا ادراک کر لیتا ہے۔

جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے تو یہ اس بلند و بالا (مگر دور) پہاڑ کی مانند ہے جس کے ندی، نالے، چشمے، جھرنے، آبشار ___ سب مل کر، دریا کے روپ میں بستی کو سیراب کرتے ہیں۔

تہذیب ___ ثقافتی سانچوں کی تشکیل میں بھی کردار ادا کرتی ہے جو اساسی کی بجائے اضافی ہوتا ہے، اس لیے اس کے اثرات بالعموم غیر واضح اور بعض اوقات تو مخفی سے بھی محسوس ہوتے ہیں اس پر مستزاد یہ کہ روحانیت کی صورت میں اگر یہ سماوی ہے تو اساطیر، مافوق الفطرت، خارق عادات اور فوک ور کی صورت میں ارضی! ان دونوں کی باہمی اثر انگیزی جن پر تضاد رویوں کو جنم دیتی ہے ہم ان کے اتنے خوگر ہو چکے ہیں کہ بالعموم شعوری طور پر ان کا احساس بھی نہیں ہوتا جیسے دین دار مسلمان کا عالمِ پریشانی میں حاجت روائی کے لئے، مسجد کے بجائے بنگالی جادوگر کے پاس جانا۔

تخلیق میں بھی اس کے مظاہر کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ مثنویاں اور داستانیں ارضیت کی حامل ہیں جب کہ قرۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا'' تہذیبی تسلسل کا مظہر ہے۔ اقبال کی شاعری سماوی ہے تو میراجی کی ارضی، انتظار حسین نے داستانوں/اساطیر کی صورت میں ماضی سے انسپریشن لیا تو منٹو جسم کا کیمرہ مین بنا!

(۲)

تخلیق کے تناظر میں تنقید کی بات کریں تو اسے خود مختار فکر، آزاد ذہنی عمل اور مضبوط ہاتھوں کی میزان ہونا چاہیئے اور یہی نہیں، نقاد کی علمیت اور شخصیت کے ساتھ ساتھ کسی حد تک وہ اجتماعی رویہ بھی اس کا باعث ہے جس کی اساس مغرب سے مرعوبیت پر استوار ہے، اگرچہ انگریزی زبان (اور اس کے ذریعہ سے مغربی تہذیب و ثقافت) کے اثرات اٹھارویں صدی سے ہی محسوس ہو رہے تھے تاہم اتنے نمایاں نہ تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد تو انھوں نے نہ صرف ٹھوس حقیقت کی صورت اختیار کر لی بلکہ سرسید جیسے دانش وروں اور (ان سے بھی پہلے) غالب کو بھی یہ احساس ہو چکا تھا کہ انگریز راج کے ساتھ ساتھ ان کی زبان و ادب، ایجادات اور ثقافت سے ہم آہنگی اور استفادہ وقت کی ضرورت ہے۔ محمد حسین آزاد کے بموجب جدید علوم جن صندوقوں میں بند ہیں اُن کی چابی انگریزی زبان ہے، تاہم یہ سوچ ہمہ گیر نہ تھی۔ اکبر اور ''اودھ پنچ'' کے طنز نگار ردِ عمل کا اظہار بھی کر رہے تھے۔

یہ تھے وہ حالات جن میں ۱۸۹۳ء میں مولانا حالؔی کا دیوان کان پور سے شائع ہوا تو ساتھ وہ ضخیم مقدمہ بھی تھا جو بعد میں جداگانہ کتاب کے طور پر چھپتا رہا اور مقدمہ شعر و شاعری کا نام پایا۔ تاریخِ نقد میں حالی کا ''مقدمہ'' اس بنا

پر زندہ رہا کہ یہ اُردو تنقید کی اصولی اساس استوار کرنے کی اوّلین کوشش تھی۔ ''مقدمہ'' پر مخالفانہ اور موافقانہ اسلوب میں بہت کچھ لکھا گیا لیکن اس کی اہمیت کم نہ ہوسکی اس لیے کہ 'مقدمہ' مغرب اور مشرق کے امتزاج کی ایسی کوشش تھی جس نے اگرچہ عصری صورتِ حال کے تحت جنم لیا مگر مستقبل پر بھی گہرے اثرات مرتسم کئے اس امر کے باوجود کہ حالی نے مغرب سے مستعار جن اصولوں کو مشرقی ادبیات پر منطبق کرنے کی کوشش کی آج ان میں خاصی سطحیت نظر آتی ہے۔ حالی کی انگریزی دانی مشکوک نہیں تو محدود ضرور ہی تھی۔ اسی لئے وہ بہت زیادہ گہرائی میں نہ جا سکے، اگر انھوں نے کولرج کی "Biographia Literaria" ہی کا مطالعہ کیا ہوتا تو 'مقدمہ' کی تنقیدی اساس زیادہ پائیدار ہوتی۔ تاہم اس عہد کے ادبی مزاج اور تخلیقی رویوں کے لحاظ سے 'مقدمہ' خاصہ کی چیز ہے یہی نہیں بلکہ 'مقدمہ' وہ اینٹ (بلکہ میں تو ٹیڑھی اینٹ کہنے کی اجازت چاہوں گا) ہے جس پر جدید اردو تنقید کی عمارت تعمیر ہوئی۔ حالی کے بعد آنے والے ناقدین کی کئی نسلوں نے یہ طے کرلیا کہ طبع زاد سوچ کی ضرورت نہیں صرف مغربی مصنفین سے استفادہ ہی کافی ہے۔ لہذا مغربی کتابوں کے اقتباسات، آراء اور افکار کے کلی پھندنوں سے مقالہ کی زینت بڑھاتے رہے۔

ادب کے بدلتے مزاج کے ساتھ مغربی مفکرین اور مصنفین کے اسماء کی تکرار میں بھی مدوجزر آتا رہا، ترقی پسندوں نے لینن سے لے کر پلیخنوف تک جملہ روسی دانش وروں سے استفادہ کیا اور خوب کیا، چوتھی اور پانچویں دہائی میں آئی۔ اے۔ رچرڈز اور ٹی۔ ایس ایلیٹ کے سب سے زیادہ حوالے ملتے ہیں، روایت کے دفاع میں جتنے مقالات قلم بند ہوئے وہ ایلیٹ کی خوشہ چینی تھے، محمد حسن عسکری اور اس کے بعد وجودی دانش وروں نے سارتر اور کامیو کے بغیر لقمہ نہ توڑا، حسن عسکری کی بدولت تھوڑی سی دیر کے لیے رینے گینوں کے نام کی بھی بازگشت سنی گئی، ان دنوں دریدا، ساسیر اور لوکاچ کا چرچا ہے، حوالوں کی تلاش میں عسکری اتنے دور نکل گئے کہ فرائیڈ کے ایک متنازعہ پیروکار ولہم رائخ کو ڈھونڈ نکالا اور اس کے تصور ''اورگون'' کی روشنی میں فراق کی شاعری کا مطالعہ کر ڈالا، اس متنازعہ نظریہ کا ادب ونقد سے کسی طرح کا تعلق نہیں بلکہ اسی کی وجہ سے امریکہ میں اسے جعلی نفسیات دان اور نیم حکیم قرار دے کر قید کی سزا دی گئی، اس کا انتقال بھی قید خانہ ہی میں ہوا۔

مختلف تنقیدی دبستانوں سے متعلق ماہرین کے افکار وتصورات سے استفادہ کا رجحان بھی رہا ہے جیسے نفسیات کے حوالہ سے فرائیڈ اور یونگ کا چرچا ہوا (خود میں بھی اس ضمن میں گناہ گار ہوں) جمالیات کے سلسلہ میں والٹر پیٹر اور کروچے کے خیالات کی تکرار ہوتی رہی۔ واضح رہے کہ جتنے بھی معروف تنقیدی دبستان ہیں ان میں سے

ایک بھی ایسا دبستان نہیں جسے ہم ''اپنا'' کہہ سکیں ان معنی میں کہ اُس نے ہمارے تخلیقی شعور سے جنم لیا ہو۔ دبستان تو خیر بڑی چیز ہے نصف صدی میں ہم تو ایک بھی نظریہ ساز نقاد پیدا نہ کر سکے۔

مغربی مصنفین کے اسماء اور کتب کے حوالوں کے شماریاتی مطالعہ سے دلچسپ بلکہ عبرت انگیز نتائج برآمد ہوں گے، بزبان اعداد یہ دل دوز حقیقت منکشف ہوگی کہ ''اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی'' تنقیدی مقالہ کو کیسے کشکول میں تبدیل کر دیتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد، اجتماعی احساسِ کمتری نے مغرب سے جس ذہنی مرعوبیت کو جنم دیا اس کے نتیجہ میں اردو تحریر میں بلاضرورت انگریزی الفاظ کا استعمال اور مغربی مصنفین سے استفادے کا تو جواز تھا مگر بدلے حالات میں بھی وہی رویہ؟

(۳)

ہم ایم۔اے اردو والوں کو یہ (تلخ) حقیقت تسلیم کر لینی چاہیئے کہ ہمیں انگریزی نہیں آتی، گائیڈز کی مدد سے بی۔اے انگریزی کا پرچہ تیار کر کے چالیس پچاس نمبروں کو انگریزی دانی کی معراج جانتے ہیں۔ جب ہم ایم۔اے اُردو، اردو کے لیکچرار بن کر ساتھ ہی نقاد بھی بن جاتے ہیں تو انگریزی کتب کا براہِ راست مطالعہ نہ ہونے کی بنا پر ثانوی مآخذ سے حوالے اور اقتباسات اخذ کرتے ہیں یہ جانے بغیر کہ کس مصنف سے استفادہ کرنا ہے اور کس سے صرفِ نظر___ لطیفہ: ایک صاحب نے لکھا! ''اس ضمن میں مشہور دانش ور جناب Posthumous کی یہ رائے ہے۔'' بھارت کے ایک نقاد نے خاتون نفسیات دان 'کیرن ہارنی' کی جنس تبدیل کر دی۔۔۔ وہ جو کہتے ہیں کہ مرد صحبت سے پہچانا جاتا ہے تو اسی انداز پر یہ بھی کہا جا سکتا کہ نقاد حوالہ دی گئی کتابوں سے پہچانا جا سکتا ہے۔

مغربی حوالوں کی سب سے زیادہ بھونڈی، بے معنی بلکہ مضحکہ خیز مثالیں علامہ اقبال پر باندھے گئے مقالات میں ملتی ہیں۔ ایم۔اے اُردو (سیکنڈ ڈویژن) ایک ہی سانس میں کانٹ، ہیگل، کرکیگار، برگساں اور نطشے کے ناموں کی یوں گردان کرتا ہے گویا ان سب کو گھول کر پی رکھا ہو جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ایک بھی فلسفی اتنا آسان نہیں کہ فلسفہ سے نابلد نقاد ان کے حوالے دے سکے۔ مانگے کے حوالوں پر مبنی ایسے ''پُرحوالہ'' مقالات سے غریب کی وہ جورو یاد آتی ہے جو امیر پڑوسن سے خوبصورت ٹی سیٹ منگوا کر ٹھنڈی اور بدمزہ چائے سے مہمانوں کی ''تواضع'' کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مغربی مصنفین، دانش وروں اور کتب کے حوالے لازمی کیوں قرار پا گئے؟

بنیادی وجہ___ ذہنی مرعوبیت اور خود پر عدم اعتماد!

ہماری تخلیقی اقدار، ثقافتی رویوں اوران سے جنم لینے والی دانش میں کبھی بھی اتنا دم نہ تھا کہ وہ مغرب سے تصادم میں اپنے قدم مضبوط زمین پر استوار رکھ سکتی۔ مسلمان ہمیشہ ہی سے سائنس، فلسفہ، منطق اور عقلی استدلال سے خوف زدہ رہے ہیں۔ خلیفہ منصوراور ہارون الرشید نے تراجم اور کتب خانوں کے ذریعہ سے علوم کی دولت سے بغداد کو مالا مال کرنا چاہا تو انھیں اس کا کیا اجر ملا؟ خلیفہ مامون الرشید کے بارے میں ابن تیمیہ سے یہ قول منسوب ہے:

''میں نہیں سمجھتا کہ خدا تعالیٰ مامون سے غافل رہے گا بلکہ اس امت پر اس (یعنی مامون الرشید) نے جو مصیبت (فلسفہ) نازل کی اس کا بدلہ ضرور اس سے لے گا۔''

اُندلس میں ابن رُشد سے جو سلوک کیا گیا وہ واحد مثال نہیں۔ کتب سوختی مسلمانوں کا محبوب مشغلہ قرار پایا۔ صرف تین ساڑھے تین سو برس تک فلسفہ و منطق سے شغف رہا پھر لمبی چپ۔ علمی ترقی اور فکری ارتقا کے لحاظ سے ہندوستان میں بھی کوئی خاص قابلِ رشک فضا نہ تھی۔ کتب خانوں کی عیاشی صرف شاہوں اور اُمراء کے لئے تھی ان میں بھی گنتی کے معدودے چند ___ جو اتفاق سے شراب و شباب کے رسیا نہ تھے، یہاں کے مدارس میں درسِ نظامی رائج تھا۔ (آج بھی بعض دینی مدارس میں یہی مروج ہے) جس میں صرف استنباطی منطق تھی اور علوم کا یہ حال کہ ہنوز بھی زمین ساکن ہے اور چاند سورج اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اس لیے اُندلس میں ابنِ خلدون، ہندوستان میں البیرونی اور ہمارے ہاں ڈاکٹر عبدالسلام پیدا ہوئے تو تعجب ہوتا ہے کہ ___ ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی؟ اورنگ زیب کے انتقال (۱۷۰۷ء) کے بعد مغل سلطنت کے ڈیڑھ سو برس جس خلفشار، انتشار اور خانہ جنگیوں میں گزرے اس کے نتیجہ میں کسی طرح کی مضبوط علمی فضا اور اعلیٰ فکری نشو ونما کی توقع ہی بے کار ہے۔ یوں طویل فکری بنجر پن نے جنم لیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد جو مغربی ثقافت اور علوم کا چراغ روشن ہوا تو سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ اپنا دامن تہی تھا، دیمک خوردہ شہنشاہیت، مردہ جاگیردارانہ نظام، کہنگی کا شکار نظامِ تعلیم، مذہب کی روح سمجھے بغیر رسوم و روایات کی صورت میں اس پر ''عمل'' ___ یہ ہیں وہ چند عوامل جن کی وجہ سے مغربی تہذیب و ثقافت، علوم، فکر و فلسفہ اور منطق نے فروغ پایا۔ حالی ''مقدمہ'' قلم بند نہ کرتے، حال نے کوئی اور حالی تلاش کر لینا تھا، مگر ہم حالی کے ''مقدمہ'' سے آگے کیوں نہ جا سکے؟ اس لئے کہ فکری سطح پر ہنوز ہم اٹھارہویں بلکہ سترہویں صدی ہی میں سانس لے رہے ہیں۔

کباب سیخ جیسی سیاسی کروٹیں لیتی پاکستان کی تاریخ کو ملحوظ رکھ کر سوچیئے کیا ہم ایسی ثقافت پیدا کر سکے جسے ''پاکستانی'' قرار دیا جا سکے؟

فکری تصادم کا جواب فکر سے ہی دیا جا سکتا ہے تو تہذیبی اور ثقافتی تصادم کا تہذیب اور ثقافت سے ہے۔ یہی عالم دانش اور علم و ادب کا بھی ہے، ہم اپنی تخلیقی ثقافت نہ پیدا کر سکے، ادبی ثقافت قومی ثقافت کی عکاس ہوتی ہے، جب وہی نہیں تو پھر اپنی تخلیقی ثقافت کیسے؟ ____ گر یہ نہیں تو بابا باقی کہانیاں ہیں!

اگر ادب زندگی کا عکاس ہے تو تنقید ادب کی، جیسی معاصر زندگی ویسا ادب اور ویسی ہی اس ادب پر تنقید، پاکستان میں مغرب پرستی جس انتہا تک جا چکی ہے، لاتعداد مثالوں میں سے صرف انگلش میڈیم سکولوں سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے گرین کارڈ کے حصول کے لیے جو نسل تیار ہو رہی ہے ان سے اردو زبان سے محبت کی توقع بیکار ہے، ''کامکس'' پر پلنے والے بچوں کو اردو ادب سے کیا لینا؟

گزشتہ نصف صدی میں نہ سیاسی استحکام پیدا ہوا نہ جمہوری اقدار، نہ اسلام، اس کا روحانی ورثہ، نہ اخلاقی اقدار نہ معاشرتی معیار ____ اسی لئے ہم اپنی شناخت گنوا کر محض Paki بن کر رہ گئے (یاد رہے کہ برطانیہ کی ایک عدالت نے اس لفظ کو گالی کا مترادف قرار دے کر اس کا استعمال ممنوع قرار دیا ہے)۔

ہماری زندگی جن بے معنی کلیشوں پر بسر ہو رہی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مشرق میں روحانیت ہے اور مغرب میں مادّیت ____ پاکستان میں اس روحانیت کا جو عملی مظاہرہ ہوتا ہے اس کی گواہی اخبارات دے رہے ہیں مزید شہادت درکار ہو تو سعودی عرب تشریف لے جایئے۔

اگر ادیب عصری محرکات کے زیرِ اثر ہے تو ان سے نقاد کیسے محفوظ رہ سکتا ہے؟ ان پر مستزاد یہ امر کہ اردو نقاد بنیادی طور پر خوف زدہ انسان ہے، ڈرتا ہے کہ کہیں اوریجنل بات بارِ خاطر نہ بن جائے، نئی سوچ متنازعہ نہ ثابت ہو، لہٰذا محفوظ طریقہ مغربی مصنفین سے استفادہ میں نظر آتا ہے، ہماری تنقید کا بیشتر حصہ کلاس روم نوٹس یا ان سے مشابہہ تشریحی اندازِ نقد پر مشتمل ہوتا ہے۔ جتنا بڑا پروفیسر اتنے اعلیٰ کلاس نوٹس!

ذرا چشمِ تصور سے کام لیجئے اگر ضیاء الحق نے ایک سہانی صبح زکوٰۃ کے نفاذ کی مانند، تنقید میں مغربی حوالوں پر قدغن عائد کر دی ہوتی تو آج ہماری تنقید کا رنگ کیسا ہوتا؟ ____ ذہنی اور فکری طور پر ہم ۱۸۹۳ء سے آگے نہ جا سکے!

مغرب سے ادبی تصورات اخذ کرنے والے دانش وروں/ ناقدین/مفکرین نے کبھی بھی اس امر پر توجہ نہ دی کہ مغرب کے ایسے کتنے تصورات ہیں جو اردو زبان، ہماری ادبی روایات، معاصر تخلیقی رویوں اور مسلّمات و

معیارات سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں؟ کیا مغربی دانش کی روشنی میں کلاسیکی شعرا سے لے کر معاصر تخلیق کاروں کا زیادہ بہتر تجزیہ و تحلیل ہو سکتی ہے؟ کیا تخلیق شناسی اور قدر پیمائی کے لیے زیادہ بہتر اور موثر پیمانے مہیا کر سکتے ہیں؟ ( جیسے جمالیات، مارکسیت اور نفسیات نے کئے )

اس وقت ساختیات، جدیدت، ردِ تشکیل اور مابعد جدیدیت پر اردو فاضلین کے جو مقالات طبع ہو رہے ہیں، ان میں اُن تصورات کے داعی ماہرین کے خیالات کا اچھا خلاصہ پیش کر دیا جاتا ہے مگر ان کے خیالات کی روشنی میں شاید ہی کسی نے ماضی اور حال کی تخلیقات کا اچھا مطالعہ کیا ہو، اس لیے کہ یہ ہماری ادبی صورتِ حال پر منطبق نہیں ہو سکتے۔

مغربی مصنفین، دانش وروں اور ناقدین کے تصورات ان کی تہذیب و ثقافت، ادبی روایات اور تخلیقی ورثہ سے مشروط ہیں جب کہ شاعری کی حد تک ہمارا تخلیقی ورثہ ان سے جداگانہ بلکہ غزل کی صورت میں تو برعکس نظر آتا ہے اس لیے ان کے افکار و تصورات کو کلیتًا اپنے ادب پر منطبق کر کے ان سے مثبت نتائج کا حصول آسان نہیں۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم مغرب کے جس ماہر کی رائے سے استفادہ کر رہے ہوتے ہیں ماضی میں خود ہمارے بڑے بھی ایسی ہی بات کہہ چکے ہوتے ہیں لیکن ہمیں اس کا علم نہیں ہوتا، مثال پیش ہے، ساسیر لکھتا ہے:

> ''دوسری زبان سے آیا ہوا لفظ جیسے ہی کسی لسانی نظام کے حوالے سے زیرِ مطالعہ آ جاتا ہے وہ دوسری زبان سے لیا ہوا لفظ نہیں رہ جاتا بلکہ وہ اس زبان کے، جس میں وہ داخل ہوا، دوسرے الفاظ کی طرح بن جاتا ہے اور اس کا مرادف اور تضاد کا وہی تعلق ہوتا ہے جو اس زبان کے دوسرے الفاظ کا''

(بحوالہ مقالہ ''اردو زبان میں دخیل کا مسئلہ'' از ڈاکٹر فہیم اعظمی، ماہنامہ 'صریر' کراچی، اپریل ۲۰۰۳ء)

اب دیکھئے ڈیڑھ صدی پیشتر، ناسخ کے لکھنؤ میں، ''دریائے لطافت'' میں بھی انشاء ساسیر کو کیسے Anticipate کر رہے ہیں:

> ''جو لفظ اردو زبان میں مشہور اور مستعمل ہو گیا خواہ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی ــــــ اپنی اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح وہ لفظ بہر حال اردو کا ہے۔ اگر اصل کے موافق ہو تو صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہو تو بھی صحیح، اس کا غلط و صحیح ہونا اردو کے استعمال پر منحصر ہے، جو لفظ اردو کے مزاج کے موافق

نہیں ہے خواہ املا کے لحاظ سے درست کیوں نہ ہو (وہ غلط ہے) اور جو (لفظ)
اردو کے مزاج کے مطابق ہے وہ صحیح ہے خواہ املا کے لحاظ سے غلط کیوں نہ ہو۔''

یہ واحد مثال نہیں اس انداز کی مزید مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔

ادبی ثقافت قومی ثقافت کا عکس ہوتی ہے۔ ہم قومی ثقافت پیدا نہ کر سکے لہٰذا ادبی ثقافت کی توقع بیکار ہے، اسی لیے ثقافتی تصادم اور تہذیبی ٹکراؤ میں اردو تنقید قلم کو موثر ہتھیار نہ بنا پائی۔ تنقید کو نئے خون کی ضرورت ہے، مریض کو آکسیجن کی ___ لیکن مریض معاشرے میں نیا خون کہاں؟ آلودگی میں آکسیجن کہاں؟

آج ضرورت ہے ایسے نقاد کی جو Big Bang سے نیا جہانِ نقد وجود میں لائے، اسے ''حالی'' قرار دیا جا سکتا ہے مگر ایسا ''حالی'' جو حال کے بجائے مستقبل میں ظہور پائے گا۔